باب۔ 15

انسان

Human Being

- انسان:

انسان کا تعلق عالم خلق سے ہے اوراس کی روح عالم امر سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ روح اللہ تعالیٰ کے "کُن "یعنی ہو جا کہنے پر "فیکون "پس پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت آدمؑ کی تخلیق کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا،فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ۔ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ۔ إِلَّا إِبْلِيسَ، یعنی جب میں مکمل انسان بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں (اور یہ میرے حکم کے تحت حرکت کرے)تو اس کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ۔ پھر تمام فرشتوں نے مل کر سجدہ کیا۔ سوائے ابلیس کے،(الحجر: 29تا31)۔ یوں آدمی اصلاً جنت کا باسی ہے۔ وہ وہاں سے نکالا گیا ہے،اور یہاں اس دنیا میں اس کا قیام بالکل عارضی ہے۔

- تخلیق انسانی :

انسان عالم خلق سے ہونے کی وجہ سے تدریجاً اپنی مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے انسان پہلے ماں کے پیٹ کے مراحل سے گذرتا ہے۔ پھر بچہ بنتا ہے، آگے لڑکا بنتا ہے ، پھر جوان آدمی کہلاتا ہے اور پھر بوڑھا ہو جاتا ہے،هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا،یعنی وہی(اللہ) ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے پھر جمے ہوئے خون سے، پھر تم کو بچہ بنا کر نکالا، پھر تم کو زندہ رکھا کہ جوانی کو پہنچو، پھر بوڑھے ہو جاؤ،(المؤمن:67)۔

انسانی تکوین(یعنی تخلیق انسانی) کی چار اقسام ہیں: (1)ماں باپ سے ،جیسے عام طور پر ہوتا ہے۔ (2)بغیر ماں باپ کے ، جیسے آدم علیہ السلام۔(3)بغیر باپ کے، جیسے عیسیٰ علیہ السلام کا بی بی مریم سے پیدا ہونا۔(4)بغیر ماں کے، جیسے اماں حوا کا آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہونا۔

- روح اور اَنا:

روح اور اَنا کا فرق بھی معلوم ہونا چاہیے۔۔۔روح، اَنا کا محل ہے۔ اَنا تو اصل ہے، ایک حقیقت ہے۔ اجسام کا لحاظ کرتے ،روح کہتے ہیں۔ اَنا کا مقابلہ کسی سے نہیں۔ اَنا کہتے وقت صفات کا خیال نہیں آتا،صفات اس کے

اندر ہیں۔ روح کے ساتھ صفات کا خیال آتا ہے۔ روح کو 'میں ہوں' کا علم رہتا ہے۔۔۔ دراصل انسان کے جسم کی حیثیت مکان کی ہے اور روح کی حیثیت مکین کی ہے۔ جسم سواری ہے تو روح سوار ہے۔ ذات کا ظاہری جسم نقلی ہے، جب کہ اس کی روح یا اَنا اصل ذات ہے۔

غور کریں کہ انسان کیا ہے۔۔۔؟ کیا "انسان" سے مراد اس کا جسم ہے؟ یا اس کی روح ہے؟ کیا اس کے ہاتھ پاؤں، اس کی ہڈیوں یا گوشت سے مراد انسان ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیوں کہ یہ سب تو جنگوں میں یا حادثات میں ٹوٹ کر جدا ہوتے رہتے ہیں۔ انسان ہر ہفتے اپنے بال اور ناخن کاٹتا رہتا ہے پھر بھی اس میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اس کے جسم کا حال یہ ہے کہ سانس لیتا ہے تو اس کے ساتھ کاربن ڈائی آکسائیڈ نکلتی ہے۔ اس گیس میں کیا ہے؟ جسم کا جلا ہوا مادہ۔ بیت الخلا جاتا ہے تو فضلہ بن کر جسم کا ایک معتد بہ یعنی sufficient حصہ نکل جاتا ہے۔ پسینہ سے بھی کچھ اجزا خارج ہو جاتے ہیں۔ انسانی خلیات یعنی Human Cells کی فنا و بقا کے عمل کو دیکھیں تو سائنس دانوں کے مطابق 7 سے 12 سال میں انسان کا پورا جسم نیا ہو جاتا ہے۔

انسان کو اور اس کی روح کو، اس کے جسم سے ایک تعلق ہے۔ ایک ربط ہے۔ ایک نسبت ہے۔ جسم کا سب کچھ بدل جاتا ہے مگر وہ نسبت باقی رہتی ہے۔ اس نسبت کے توسط سے روح کو رنج و راحت اور عذاب و ثواب پہنچتے ہیں۔ روحِ انسانی جہاں جاتی ہے، جس عالم میں پہنچتی ہے چاہے وہ عالم، عالمِ خواب ہو، عالمِ مثال ہو، عالمِ برزخ ہو، یا عالمِ آخرت ہو، اسی کی مناسبت سے اسے جسم مل جاتا ہے۔ غرض یہ کہ حشر و نشر اور عذاب و ثواب ظاہری طور پر تو جسمانی ہیں لیکن ایک طرح سے دیکھو تو روحانی ہیں۔ کیوں کہ جسم، بے ادراک یعنی Without Perception اور بے علم ہے۔ علم کا مرکز تو روح ہے۔ لہٰذا اسی کو رنج ہے، اسی کو راحت ہے۔

- **انسان کی قوتِ علمی:**

اللہ تعالیٰ نے جب انسانوں، فرشتوں اور جنّات سب کا علمی امتحان کیا تو کون کامیاب ہوا۔۔۔؟ یہ خاک کا بنا ہوا پُتلا، انسان۔ یعنی آدم علیہ السلام۔ شیطان اس علمی امتحان کے مقابلہ میں ہار گیا۔ آگ سے بنا تھا۔ طبیعت میں شر و فساد بھی تھا۔ اپنی ذات کی لطافت کا دعویٰ کرنے لگا۔ اور خود کو انسان سے افضل ثابت کرنا چاہا۔ اس نادان کو یہ معلوم ہی نہیں کہ انسان میں اگر خاک ہے تو آگ کب نہیں۔۔؟ انسان میں جامعیت ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا مظہرِ تام (Perfect Exhibit) بن سکتا ہے۔ انسان میں اللہ تعالیٰ کے اوصاف و کمالات کے تماشے بھرے پڑے ہیں۔ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ، اور خود تمھاری ذات میں (اس کی قدرت کے کرشمے ہیں) کیا تم بصارت و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔۔۔؟ (الذّاریٰت:21)۔

انسان کی استعداد اور اس کی قابلیت کی کچھ انتہا نہیں۔ اس کے معلومات کی کوئی حد نہیں۔ فرشتے ہوں یا کوئی اور مخلوق، سب کا علم محدود ہے۔ جس کام کے لیے وہ مخلوق ہوئے ہیں اسی کے لائق ان کو علم دیا گیا ہے۔ ان کا علم قابلِ ترقی نہیں بلکہ جو کچھ ہے ان کو ابتدائے خلقت ہی سے مل جاتا ہے۔ ان میں تفکر اور استنباط بالکل کم ہے بلکہ سرے سے ندارد۔ جب کہ اس کے بالمقابل انسان غور سے مطالعہ کرتا ہے۔ ہوشیاری سے ترکیب و تحلیل (plan & execute) کرتا ہے۔ جزئیات و کلیات کے استخراج یعنی ان کی analyses کرتا ہے۔ اور پھر تحصیلِ نتائج یعنی conclusions نکالتا ہے۔ کسی مرتبہ پر قناعت نہیں کرتا۔ خود محنت کرتا ہے۔ دوسروں سے بھی مدد حاصل کرتا ہے۔ کتاب و کتابت سے بھی کام لیتا ہے۔ وہ، مادیات یا روحانیات جن کے پیچھے لگ پڑتا ہے کچھ نہ کچھ حاصل کیے بغیر نہیں رہتا۔ انسان نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر رہا ہے اور کرے گا وہ سب حقیقتِ انسانیہ کی تفصیل ہے۔ دادا کی قابلیتیں، پوتوں سے ظاہر ہو رہی ہیں۔ ہمارے تمام کمالات کا سرچشمہ، بابا آدمؑ ہیں۔

- فطرت آدم :

آدم کی فطرت، ایسی جامعِ کمالات و اوصاف ہے کہ کوئی اس سے سبقت نہیں لے جا سکتا۔ وہ حقائقِ اشیا کو جانتا ہے۔ آگ، پانی، مٹی، پتھر سب اس کی حکومت اور قبضۂ قدرت میں ہیں۔ تمام حیوانات اس کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ تمام نباتات کھڑے اس کا منہ تک رہے ہیں۔ جمادات اس کے زیرِ قدم پامال ہو رہے ہیں۔ وہ جنات کو شیشہ میں اتارتا ہے۔ عروج و ترقی کرتا ہے تو نعلین پہنے عرشِ اعظم تک پہنچتا ہے۔ سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا یعنی پاک ہے وہ ذات جو ایک رات اپنے بندے کو باحرمت مسجد سے (یعنی مسجد کعبہ سے) مسجد اقصا (یعنی بیت المقدس) کی طرف لے گیا جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنا دیا ہے تاکہ ہم اس (بندۂ کامل) کو اپنی نشانیاں دکھا سکیں، (الاسراء:1)۔ مگر جب سر میں ہوا بھرتی ہے تو یہی انسان خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ گرتا ہے تو اس حد تک گر جاتا ہے کہ "اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ" (پست ترین حالت) تک پہنچ جاتا ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ یعنی پھر ہم نے اس کو پست ترین حالت میں ڈال دیا، (التین:5)۔ وہ تلسی کی، بڑ کے درخت کی، آگ کی، مٹی کی، سانپ کی، ستاروں کی، سب کی پوجا کرتا ہے، حتیٰ کہ گائے ماتا کا پیشاب بھی پی جاتا ہے۔ ذرا غور کریں کہ اس کا کتنا عروج ہے۔۔! اور کتنا نزول۔۔!

- **انسان کا زوال اور ارتقاء:**

مولانا عبد القدیر صدیقیؒ، شرح و ترجمہ فصوص الحکم کے اپنے ایک تمہیدی باب میں اس موضوع پر یوں رقم طراز ہیں کہ۔۔۔ "حضرت سہلؒ ابن عبد اللہ تستری اور عمرؒ بن ابراہیم خیام نے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ سے سلسلۂ تکوین و خلق (یعنی تخلیق سے عالم وجود میں لانے تک کے سلسلے) میں جس قدر بُعد (اور فاصلہ) ہو گا اتنی ہی شرّیت بڑھے گی۔ مثلاً پہلے ذرّات یا ہبائے منثور (یعنی منتشر گرد و غبار) ہیں، پھر جمادات، پھر نباتات، پھر حیوانات اور پھر انسان۔ یہ دائرۂ وجود کا" قوسِ نزولی" (یعنی اُتار) ہے۔۔۔ پھر انسان ترقی کرتا ہے۔ حتٰی کہ حضرتِ حق جلّ وعطا سے واصل ہو جاتا ہے۔ یہ "قوسِ صُعودی" (یعنی چڑھائی) ہے۔

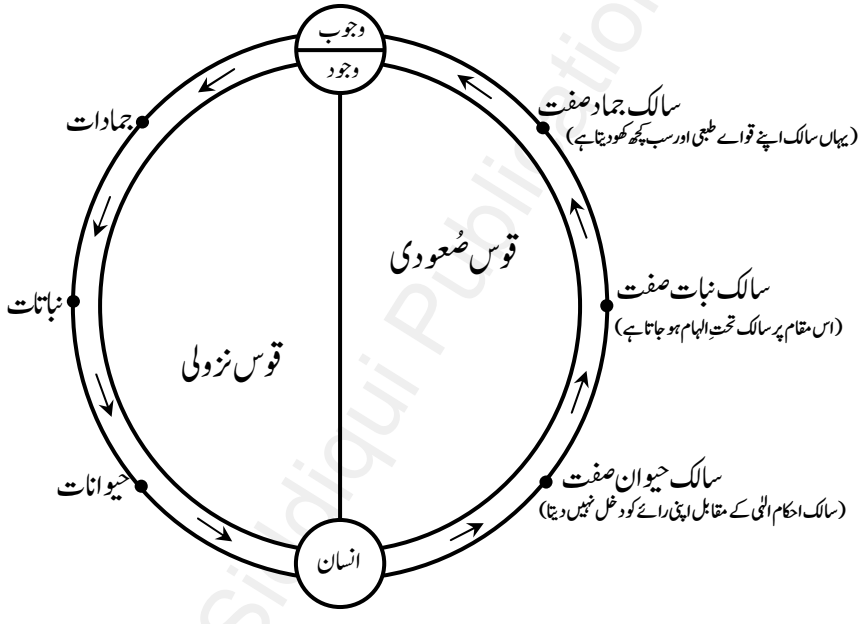

خاکہ: انسان کا راہِ نزول اور راہِ سلوک

انسان کا ابتدائی نقطہ جس میں وہ بندۂ عقل رہتا ہے، سب سے کم تر ہے۔ حیوانات اس سے بہتر ہیں۔ ان سے بہتر نباتات، ان سے بہتر جمادات ہیں اور اقرب الی اللہ ہیں۔ پھر جب انسان، سالک، راہِ خدا ہوتا ہے اور ترقی کرنا شروع کرتا ہے تو وہ حیوان صفت بنتا ہے۔ یعنی احکام الٰہی کے مقابل اپنی رائے کو دخل نہیں دیتا۔ صرف جزئی طور پر اس کی عقل کام کرتی ہے۔ پھر جزئی طور پر بھی عقل کام نہیں کرتی بلکہ سالک، تحتِ الہام ہوتا ہے اور وہ سالک نبات صفت کہلاتا ہے۔ پھر تمام قوائے طبعی یعنی علم، سماعت، بصارت، قوتِ ارادہ سب کچھ کھو دیتا ہے تو اس وقت وہ سالک، جماد صفت ہو جاتا ہے۔ اس کے اس کمال پر فنا ہے"۔